البنّا اور احیاے اسلام: یادوں کے جھروکے

پروفیسر خورشید احمد

حسن البنا شہید سے میرے تعلق کی بنیاد بڑی منفرد ہے۔ وہ اسلامی تاریخ کی ان چند مرکزی شخصیات میں سے ہیں جن سے ملاقات نہ کرنے کی حسرت ہمیشہ رہے گی۔ مجھے اپنے بچپن میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا شوکت علی اور علامہ محمد اسد کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مگر مولانا محمد علی جوہر اور علامہ محمد اقبال دو ایسی شخصیات ہیں جن کو نہ دیکھنے کا قلق رہا ہے۔ ا س تسلسل میں جس تیسری شخصیت کو دیکھنے کی تمنا، خواہش اور شوق رہا، وہ حسن البنا شہید تھے۔

حسن البنا کی شخصیت میں ایک غیر معمولی سحر انگیزی (charisma) اور دل کش جاذبیت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے حسن البنا کے قالب میں ایک ایسی بے چین روح ہے، جو اپنے رب کی خوش نودی حاصل کرنے، اس کی مرضی و ہدایت کی روشنی میں دنیا کو بدل ڈالنے اور اسے مالک و خالق کی اطاعت میں لانے کے لیے ہر آن سرگرداں اور مضطرب ہے۔ یہ کیفیت ان کے بچپن سے لے کر جوانی اور پھر شہادت کے لمحات تک موجزن نظر آتی ہے۔ مجھے بے شمار مفکرین کو پڑھنے، استفادہ کرنے، اور بہت سے اہلِ دل سے ملنے کی سعادت بھی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن جو کرشماتی کیفیت حسن البنا شہید کی زندگی، ان کے ر وز و شب اور ان کے مکالمات و معاملات میں نظر آتی ہے، اور وہ بھی نہایت فراوانی کے ساتھ، وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ اسی لیے مجھے ایسی دل آویز شخصیت کو نہ مل سکنے پر احساس تاسف ہمیشہ رہے گا۔

اخوان کے تیسرے مرشد عام جناب عمر تلمسانی مرحوم سے لے کر موجودہ مرشد عام محمد مہدی عاکف تک سبھی سے مجھے ملنے کا شرف حاصل ہے۔ کچھ سے تو خاصی قربت بھی رہی ہے، جیسے جناب استاد مصطفی مشہور اور جناب مامون الھضیبی۔ مامون الھضیبی کے والد حسن الھضیبی جو حسن البنا مرحوم کے بعد دوسرے مرشد عام تھے، ان سے ملاقات تو نہیں ہوئی، البتہ خط و کتابت کی سعادت حاصل ضرور ہوئی۔ اسلامی جمعیت طلبہ کے دور میں انھوں نے اپنی تحریروں سے بھی نوازا۔ ان مواقع کے باوجود حسن البنا جیسے عبقری قائد سے ملنے کے شوق اور نہ مل سکنے کی حسرت اپنی جگہ موجود ہے۔ انسان کسی عظیم شخصیت سے ملاقات میں کچھ حاصل کرتا ہے یا کچھ حاصل نہیں کر پاتا، یہ دوسری بات ہے، لیکن ایسے پاک طینت اشخاص اور اہل اللہ کو دیکھنا اور ان کی مجالس میں بیٹھنا بھی روحانی تعلیم و تربیت کے زمرے میں آتا ہے۔ اس اعتراف حقیقت کے ساتھ ساتھ ایک اور اعتراف بھی شاید بے محل نہ ہو۔ مجھ جیسے عقلیت زدہ انسان پر بھی یہ کیفیت بار بار گزری ہے کہ حسن البنا شہید کو اپنے قریب پایا ہے۔ ان سے صحبت اور بالمشافہہ استفادے کے باب میں محرومی کے باوجود ان سے ایک ایسی نسبت زندگی بھر محسوس کی ہے جسے روحانی ملاقات کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ ایک روحانی تجربہ ہے یا محض اپنی خواہشات کی تسکین کہ بارہا زندگی میں ان سے قربت اور ان کے حلقۂ مریداں میں شرکت کی لذت محسوس ہوئی ہے۔ یہ اللہ کا فضل اور ان کی طلسماتی شخصیت کا کرشمہ ہے۔

○ پہلا تعارف: حسن البنا شہید کی داستانِ حیات، مقصدِ زندگی اور دعوتی و تحریکی خدمات کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ برادرم سعید رمضان مرحوم ہیں۔ سعید رمضان، حسن البنا شہید کے نہایت قریب اور معتمد علیہ تھے۔ حسن البنا، رسالہ الشہاب نکالتے تھے، جس کی ادارت میں سعید رمضان کا اہم کردار تھا۔ وہ نہایت ذہین، صاحب علم اور دعوت کو سمجھنے والی بھرپور شخصیت کے مالک تھے۔ مجھے، خرم بھائی [خرم مراد] اور راجا بھائی [ظفر اسحاق انصاری] کو ان سے ملنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا شب و روز موقع ملا۔ اس طرح ہم بڑے خوش نصیب تھے کہ ہمیں ان کے بہت ہی قریبی ساتھی اور نوجوان شاگرد کے ذریعے، جو بعد میں ان کے داماد بنے، حسن البنا کی شخصیت اور ان کی فکر، اخوان کی دعوت، اخوان کے نظام تربیت اور اجتماعی

جدوجہد کے اسلوب سے واقفیت ہوئی۔ اسی طرح امام حسن البنا کے بیٹے سیف الاسلام اور نواسے ڈاکٹر طارق رمضان بن سعید رمضان سے بھی ہمیں ان کے حالات جاننے کا موقع ملا۔

سعید رمضان دسمبر ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئے اور پھر فروری ۱۹۴۹ء میں امام حسن البنا کی شہادت کے بعد کچھ عرصہ کے لیے یہیں مقیم ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں وہ عرب دنیا میں پاکستان کو متعارف کروانے کے لیے گئے اور پھر ۱۹۵۱ء کی مؤتمر عالم اسلامی کی دوسری کانفرنس میں شریک ہوئے، اور اس کے معتمد عام دوم منتخب ہوئے۔ کانفرنس میں سعید رمضان کی تقریر مسحور کن تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں تقریر کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا۔ عربی میں تو وہ قادر الکلام تھے ہی، لیکن انگریزی پر مکمل دسترس نہ رکھنے کے باوجود، ان کے اظہار بیان میں تاثیر کچھ کم نہ تھی۔ فکر و جذبات کا جو موثر اظہار ان کی خطابت میں تھا، وہ قابل رشک تھا۔ خاص طور پر نوجوانوں کو وہ مسحور کرنے اور عمل پر اُبھارنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے تھے۔

پاکستان میں ان کے قیام کے دوران میں ہی چونکہ اخوان المسلمون پر پابندی لگا دی گئی تھی اور امام حسن البنا شہید کر دیے گئے تھے، اس لیے وہ یہیں ٹھیر گئے۔ آرام باغ، کراچی میں ایک فلیٹ انھوں نے کرایے پر لے لیا تھا۔ یہ فلیٹ ہماری ملاقاتوں کا مرکز بن گیا تھا۔ شاید ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہوگا کہ ہم ان سے نہ ملتے ہوں۔ مولانا ظفر احمد انصاری مرحوم و مغفور سے جو راجا بھائی کے والد محترم اور تحریک پاکستان کے اہم قائد تھے، ان سے سعید رمضان کا غیر معمولی تعلق خاطر تھا۔ وہ مولانا انصاری صاحب سے باپ کی طرح محبت کرتے تھے اور انصاری صاحب، سعید رمضان سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرتے تھے۔ پاکستان میں قیام کے زمانے میں انھوں نے خود کو مختلف مفید کاموں میں مشغول رکھا، اور خاص طور پر کراچی کے نوجوانوں کو اسلامی مقاصد کے لیے سرگرم عمل کرنے میں کوشاں رہے۔ انھوں نے ان کی اچھی خاصی تعداد میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ریڈیو پاکستان سے اسلام اور قرآن پر عربی تقاریر کا سلسلہ شروع کیا جو عرب دنیا میں بہت مقبول ہوا۔

○ فکر اور قلب کا راستہ: اخوان اور حسن البنا شہید سے ہم جس راستے سے روشناس ہوئے وہ کتابی راستہ نہیں تھا۔ مولانا مودودی، میرے والد گرامی نذیر احمد قریشی مرحوم کے گہرے

دوست تھے۔ اس مناسبت سے مجھے مولانا مودودی کو دیکھنے کی سعادت تو ۱۹۳۸ء میں حاصل ہوگئی تھی، البتہ مولانا مودودی تک رسائی ان کی کتابوں ہی کے ذریعے ممکن ہوسکی۔ اس کے برعکس حسن البنا اور اخوان تک رسائی ان افراد کے ذریعے ہوئی، جنھیں حسن البنا شہید نے تیار کیا تھا۔ دونوں کے درمیان یہ ایک بڑی وجۂ امتیاز ہے کہ مولانا مودودی فکر اور دماغ کے راستے، اور حسن البنا قلب اور روح کے راستے انسانوں کی زندگیوں میں داخل اور ان کی قلب ماہیت کرنے کا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔ خود میری زندگی میں بھی یہ دونوں انھی راستوں سے داخل ہوئے، اور آج تک فکر اور قلب میں سمائے ہوئے ہیں۔

مولانا مودودی تحریر و تقریر میں ممتاز، اعلیٰ درجے کے منتظم، بلند پایہ مدبر اور تحریک کے قائد تھے۔ اس طرح تحریک میں ہر حیثیت سے ان کا کردار بڑا نمایاں رہا ہے۔ یہ اوصاف اپنی جگہ بڑی مرکزیت رکھتے ہیں، تاہم مولانا محترم کی شخصیت کا سب سے زیادہ غالب پہلو، ان کی فکر، ان کی تحریر اور وہ عظیم الشان لٹریچر ہے، جس نے افراد کے دل و دماغ میں طوفان بپا کیا اور ایک پوری نسل کی زندگی کا رخ بدل کر رکھ دیا۔ اسی طرح اگرچہ حسن البنا شہید کی تقاریر اور کتابیں بھی ہیں اور علمی اور عملی ہر دو اعتبار سے ان کا بڑا بلند مقام بھی ہے، لیکن ان سب اوصاف کے ساتھ حسن البنا کا نمایاں ترین وصف انسان سازی ہے۔ ان کا بلند ترین کارنامہ روح سے روح کا اتصال ہے۔ بلاشبہہ اس میں دلیل کی قوت کے ساتھ عقل کو اپیل بھی شامل ہے، لیکن ان کی شخصیت، ان کی دعوت اور ان کی تحریک کا اصل ہدف انسان کا قلب ہے۔ ان کی تقریروں کو پڑھتے وقت احساس ہوتا ہے کہ: ان کی زبان کے ساتھ ان کی روح بھی بولتی تھی۔ ان کے اس خاص اسلوب اور اثر انگیزی کو روحانی ٹیلی پیتھی (spiritual telepathy) یا خیال رسائی کہا جاسکتا ہے۔

اخوان المسلمون پر لکھا وسیع لٹریچر مجھے پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ اخوان سے وابستہ اہل قلم نے بڑی مفید ذاتی یادداشتیں تحریر کی ہیں۔ یہ یادداشتیں نہ صرف تاریخی اعتبار سے، بلکہ فکری موضوعات کے لحاظ سے بھی معاصر اسلامی ادب کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں۔ اس تحریری لوازمے سے استفادے کے باوجود حسن البنا اور اخوان کو سمجھنے کے لیے جو چیز سب سے زیادہ پُرکشش

ذریعہ رہی، وہ اخوان کے قائدین کی گفتگوئیں اور ان کے ساتھ زندگی گزارنے کے وہ مواقع ہیں جو مجھے حاصل ہوئے۔ اس طرح ان سے کتابی سے زیادہ قلبی رشتہ قائم ہوا۔

○ ایک سحر انگیز شخصیت: اس تناظر میں میرے دل و دماغ پر حسن البنا شہید کی جس چیز کا سب سے زیادہ اثر ہے، وہ ان کی مسحور کن شخصیت ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک ایسی پاک روح ہے جسے دیکھ کر اللہ کی یاد انسان کے دل میں اُتر جائے اور ایمان میں حرارت وحلاوت محسوس ہو۔ امام حسن البنا کی آپ بیتی یا دعوتی سفر کی یادداشتوں (مُذَکّرات) کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسی شخصیت کے حامل انسان تھے۔ انھیں پڑھتے ہوئے یہ منظر سامنے آتا ہے کہ چھے سات سال کی عمر کے بچے کا دل دینی جذبات کا اُمنڈتا ہوا سرچشمہ ہے۔ پھر یہی بچہ ۱۷'۱۸ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے قاہرہ اور اسکندریہ کے ریستورانوں، قہوہ خانوں اور سماجی محفلوں میں، تفریحی مقامات اور مختلف لوگوں سے مذاکرات تک میں، ہر جگہ ایک ایسی بے چین روح اور محبوب شخصیت کی صورت میں نظر آتا ہے، جو اپنے مالک سے محبت اور تعلق خاطر کی لذت سے سرشار ہے۔ مگر اس شخصیت کا اس سے بھی زیادہ خوب صورت پہلو یہ ہے کہ وہ نیکی اور پاکیزگی، کامیابی اور ابدی کامرانی کی اس لذت کو اپنی ذات تک محدود کرنے کے روایتی تصور کو نہیں اپناتی، بلکہ یہ مضطرب روح، اللہ کے بندوں کو، اللہ کے غضب سے بچانے اور رب کی بندگی میں لانے کے لیے سرگرم و کوشاں ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ۲۱ سال کے اندر مصر کا ہی نہیں، بلکہ عالم عرب کا پورا فکری نقشہ بدل دیا اور دنیا میں ایک تہلکہ سا مچا دیا۔

۱۹۲۸ء میں، اسماعیلیہ کے مقام پر منظم انداز سے دعوت کا آغاز کرنے والے حسن البنا نے ۱۹۴۹ء میں جام شہادت نوش کیا۔ ان کی شہادت کے وقت پورے مصر میں اخوان کے لاکھوں وابستگان تھے اور ۲ ہزار سے زیادہ شاخیں تھیں، جب کہ صرف قاہرہ میں ۲۰۰ تنظیمی حلقے تھے۔ امام البنا مہینے میں ۲۰'۲۲ دن سفر پر رہتے تھے۔ شہر شہر، قریہ قریہ لوگوں سے ملتے اور ان سے مخاطب ہوتے تھے۔ کنواں خود پیاسوں کے پاس پہنچتا، رات دن کی پروا کیے بغیر، نیند اور تھکن کو خاطر میں لائے بغیر، قلب وروح کے دروازوں پر دستک دینے والے اس محسن کا نام حسن البنا تھا۔ جن دنوں وہ سفر میں نہیں ہوتے تھے، ان دنوں جہاں کہیں بھی ان کا مستقر ہوتا، وہ وہیں پر دعوتی

سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ کوئی مسجد، محلہ حتیٰ کہ وہ جگہیں بھی جنھیں لوگ بالعموم اہل تقویٰ کے لیے کوئی بہت اچھی جگہ نہیں سمجھتے، مثلاً کلب، عام ریستوران، اور ایسے ریستوران بھی جہاں نغمہ وسرود کی محفلیں برپا ہوتیں، وہ وہاں جا پہنچتے۔ ان جگہوں پر بھی بلامبالغہ ان کو بڑی عزت سے دیکھا جاتا تھا۔ حسن البنا نے کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں انھوں نے مقدور بھر شہادت حق کا فریضہ ادا نہ کیا ہو۔ وہ لوگ جو ان سے اختلاف کرتے تھے، وہ بھی ان کی روحانیت، ان کی ربانیت، ان کے اخلاص اور مقصد سے ان کی والہانہ وابستگی کی مٹھاس کو محسوس کرتے تھے اور بے اختیار احترام کرتے تھے۔ یہ کیفیت آج تک موجود ہے۔ ان کی شخصیت کا یہی وہ طلسماتی پہلو ہے، جس سے ارباب اقتدار اور عالمی سامراج خوف زدہ تھے، اور ان کو اپنے عزائم کے حصول کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

سعید رمضان مرحوم نے اپنی اہلیہ جو امام شہید کی صاحبزادی ہیں، کی تربیت کے حوالے سے مجھے بتایا کہ اس گھرانے پر اللہ تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے۔ یہ خاتون عبادت، سخاوت اور وفاشعاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ سعید رمضان پر آزمایش اور بیماری کے بڑے سخت دور گزرے ہیں۔ مگر اللہ کی اس بندی نے اولاد کی بہترین تربیت کی اور شوہر کو بھی سہارا دیا۔ اس حسن تربیت کی ایک مثال ان کے صاحبزادے طارق رمضان کا اپنے والد کے قریبی دوستوں سے احترام کا رویہ ہے۔ وہ مجھ سے ہمیشہ اس احترام سے پیش آئے، جو ایک اچھے مسلم معاشرے میں باپ کے ایک قریبی ساتھی کا حق سمجھا جاتا ہے۔ ضمناً عرض ہے کہ طارق رمضان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ حسن البنا، یعنی اپنے نانا پر ہے، جو فرانسیسی زبان میں ہے۔ افسوس ہے کہ ابھی تک اس کا ترجمہ شائع نہیں ہوا۔

○ اصل کارنامہ: ۲۰ ویں صدی کے آغاز میں اُمت مسلمہ زبوں حالی اور غلامی کے جس مقام پر پہنچ چکی تھی، اس میں امت مسلمہ خاص طور پر عرب دنیا کو دوبارہ حقیقی وژن دینا حسن البنا شہید اور اخوان کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس کو اپنا حقیقی مشن یاد دلانا، امت میں خود اعتمادی کی کمی کا جو بحران پیدا ہوگیا تھا، اس بحران سے نکالنا۔ پھر اس مشن کو حاصل کرنے کے لیے امنگ، پروگرام، تنظیم اور تحریک فراہم کرنا، یہ عظیم کارنامہ ہے، جس میں حسن البنا شہید کا کردار کلیدی اور فیصلہ کن ہے۔ مولانا مودودی نے جو کام برعظیم پاک و ہند میں کیا، وہی کام ایک مؤثر انداز میں حسن البنا شہید

اور ان کے ساتھیوں نے عرب دنیا میں انجام دیا۔ آج عالمی اسلامی احیا کی لہر کو اس مقام تک پہنچانے کا سہرا اللہ کی توفیق اور فضل سے بنیادی طور پر انھی دو شخصیات کے سر ہے۔ بلاشبہہ اس میں علامہ محمد اقبال کا بھی ایک اہم کردار ہے، لیکن اس کا دائرہ فکری ہے، جب کہ دعوت، تنظیم، تربیت اور لائحہ عمل انھی دو شخصیات سے منسوب ہے۔

للّٰہیت اور درویشی حسن البنا شہید کی شخصیت کے غالب ترین پہلو ہیں۔ دعوت کی تڑپ اور وہ لگن کہ جس کا اظہار انھوں نے بچپن سے لے کر شہادت تک کیا، زندگی کا حصہ بنا ہے۔ اسی طرح ان کے ہاں اسلام کا تصور بہت صاف اور ہمہ گیر ہے۔ ان کے نزدیک فرد، معاشرے، ریاست اور تاریخ کے لیے اسلام ہی ایک دعوت انقلاب ہے۔ گویا کہ اللہ کی بندگی کی بنیاد پر زندگی کے پورے نظام کی تعمیر اور انسان کو خلافت کا جو منصب دیا گیا ہے، اس کے تقاضوں کو ہر سطح پر، انفرادی اور اجتماعی طور پر پورا کرنا زندگی کا لائحہ عمل ہے۔

اس وژن اور تصور میں مجھے ان کے ہاں تین اور خوبیاں نمایاں نظر آتی ہیں، اوّل: بندے کا رب سے مضبوط تعلق، پھر بندوں کا بندوں سے ہمدردی، وقار، اور بے لوثی پر مبنی تعلق۔ انھوں نے اس پہلو کو بہت مرکزی حیثیت و اہمیت دی۔ دوم: اجتماعیت ہے۔ اس کے لیے انھوں نے چار اصطلاحیں استعمال کی ہیں: پہلی: مسلمان خاندان (اسرہ)، دوسری مسلمان معاشرہ (مجتمع یا سول سوسائٹی)، تیسری: مسلمان مملکت (دولۃ یا اسٹیٹ)، اور چوتھی: عالمگیر اسلامی امہ، اور اس میں انھوں نے عرب قومیت اور اسلامی قومیت کو گڈ مڈ کرنے کی ٹھوکر نہیں کھائی۔ انھوں نے جہاں عربیت اور عربی قومیت کو اسلامی قومیت کا حصہ اور اسے قوس قزح کے رنگوں میں سے ایک رنگ قرار دیا ہے، وہیں انھوں نے عربی قومیت کو طاغوت نہیں بننے دیا، بلکہ اسے اسلامی معاشرے کا نمایاں اور روشن حصہ بنایا ہے۔ تیسرا یہ ہے کہ انھوں نے انفرادی انقلاب کو جو فرد کے اندر پیدا ہوتا ہے، اور اجتماعی انقلاب جو فرد کے ذریعے سوسائٹی میں رُو پذیر ہوتا ہے، ان کا آپس میں مضبوط بندھن قائم کیا ہے، اور اس چیز کو اداراتی سطح پر منظم کیا ہے۔

سعید رمضان نے ہمیں ایک واقعہ یہ سنایا تھا، کہ اخوان کے کسی ساتھی سے کوئی غلط کام ہو گیا، جس پر معذرت کی غرض سے وہ امام حسن البنا کے پاس ایک سوا گھنٹہ رہا، لیکن انھوں نے اس

ساتھی کو یہ موقع ہی نہیں دیا کہ وہ معذرت کر سکے۔ وہ پیار اور محبت سے ساتھی کی دل جوئی کرتے رہے کہ اس کو یہ ہمت نہیں ہوسکی کہ وہ معذرت کے الفاظ زبان پر لاسکے، حالانکہ امام شہید کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ ساتھی معذرت کرنے کے لیے ہی آیا ہے۔ اسی طرح بعض نوجوان ان کے پاس آتے اور خلافِ شرع چیزیں، مثلاً سونے کی انگوٹھی وغیرہ پہنے ہوتے، تو حسن البنا ان کو نہ ٹوکتے۔ لیکن تھوڑے ہی دن کی صحبت کے نتیجے میں ان کی انگوٹھی بغیر کچھ کہے اُتر جاتی تھی۔

ہمارے اخوان سے تعلق کا ایک اہم حوالہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے صرف جماعت اسلامی کو ہی نہیں، بلکہ پاکستان کو اور پاکستان کے تصور کو بھی عالم عرب میں پورے شعور کے ساتھ سمجھا اور پوری دل جمعی سے سمجھایا ۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۶ء سے شروع ہو جاتا ہے ،جب قائداعظم [۱۸۷۶ تا ۱۹۴۸ ء] اور حسن البنا شہید کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس طرح عالم عربی میں اخوان، پاکستان کے سب سے بڑے ہم نوا تھے۔ پاکستان بننے پر انھوں نے مصر بھر میں پاکستان کا جشن استقلال منایا۔ سعید رمضان نے تو قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۰ء میں بہت سے مسلم ممالک خاص طور پر عرب ممالک کے طول وعرض کا دورہ کر کے پاکستان کے تصور کی وضاحت کی تھی۔

○اخوان کے گہرے اثرات: مجھے کئی بار مصر جانے کا موقع ملا ہے۔ اس میں وہ زمانہ بھی شامل ہے کہ جب شدید گھٹن اور سخت آمرانہ گرفت کا دور دورہ تھا اور کسی کے لیے اف تک کرنے کی گنجایش نہیں تھی۔ ان دنوں میں بھی مجھے ہوٹلوں کے خدمت گار ملازمین (ویٹرز) تک نے اخوان اور حسن البنا کے بارے میں اپنے والہانہ جذبات سے آگاہ کیا۔

۱۹۵۴ ء میں، مصر کے فوجی آمر مطلق ناصر کا دورِ عروج تھا اور ناصر کی مطلق العنانی جنون کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ کوئی فرد اس کے خلاف دبی زبان میں بھی بات نہیں کرسکتا تھا۔ اخوان پر پابندی تھی، اس کے ہزاروں کارکنان گرفتار تھے۔ دسمبر ۱۹۵۴ء میں جب میں جمعیت میں تھا، ایک روز خبریں سنتے ہوئے معلوم ہوا کہ مجاہد کبیر شیخ محمد فرغلی سمیت اخوان کے چھے رہنماؤں [عبد القادر عودہ، یوسف طلعت، ابراہیم طیب، محمود عبداللطیف، ہنداوی دویر] کو پھانسی دے دی گئی ہے۔ یہ خبر ہمارے لیے گہرے صدمے کا باعث بنی۔ اس موقع پر ہم نے کراچی میں بھرپور احتجاج کیا۔
اسی زمانے میں انٹرنیشنل اسمبلی آف مسلم یوتھ (IAMY) کی ایک کانفرنس کراچی میں

منعقد ہوئی تھی، جس میں مصر کا سرکاری وفد شرکت کے لیے آیا تھا۔ اس وفد کے سربراہ مصری فوج کے ایک کرنل تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف سے ہم نے اس کانفرنس میں، اس ظلم وزیادتی کے خلاف بھرپور احتجاج کیا۔ اسی مناسبت سے ایک بڑا مؤثر دو ورقہ (پمفلٹ) راجا بھائی اور میں نے انگریزی میں تیار کیا تھا: WHY OPPRESSION ON MUSLIM BROTHERHOOD? [اخوان المسلمون پر ظلم کیوں؟]— جسے ہم چھپوا کر اور چھپا کر کانفرنس ہال میں لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ جوں ہی پاکستان کے وزیراعظم محمد علی بوگرا کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لیے ہوٹل میٹروپول کے پنڈال میں داخل ہوئے، اس دو ورقے کی ایک کاپی انھیں دی گئی۔ اسی لمحے مختلف جگہوں پر کھڑے جمعیت کے ساتھیوں نے بڑے منظم انداز سے تمام قطاروں میں ہر شخص تک یہ پمفلٹ پہنچا دیا۔ اس واقعے سے پوری کانفرنس میں تہلکہ سا مچ گیا۔ مصر کے سرکاری وفد کو تو گویا آگ لگ گئی، اور ادھر ہماری حکومت حرکت میں آ گئی۔ میں جمعیت کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شریک تھا۔ خرم بھائی نے مصری وفد کے سربراہ کی تقریر کے دوران ہال میں کھڑے ہوکر، اسے مخاطب کر کے کہا: تمھارے ہاتھ اخوان المسلمون کے راہ نماؤں کے خون سے رنگے ہوئے ہیں، تم قاتلوں کے ساتھی ہو۔

اس کشیدہ صورت حال کے باوجود، مصر کے سرکاری وفد میں شامل ایک نوجوان طالب علم بڑی خاموشی سے آ کر ہمیں ملا اور اس نے کہا کہ: ''میں دل وجان سے اخوان کا ہمدرد ہوں۔ آپ لوگوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر جو اقدام کیا ہے، وہ حق پر مبنی ہے۔ میں اپنے ہزاروں مظلوم ساتھیوں کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں''۔

دراصل عوامی سطح پر جو لوگ اخوان کے گرویدہ ہیں، وہ تو گرویدہ ہیں ہی، مگر جو اس تحریک سے باہر ہیں، میں نے ان پر بھی اخوان کا بے پناہ فکری و اخلاقی اثر دیکھا ہے۔ اعلیٰ سطح کے اجلاسوں میں، پارلیمنٹ کے اندر، وزرا اور عرب لیگ کے افسروں سے مجھے بات کرنے کے بہت سے مواقع ملے ہیں، اور جب بھی کھلے دل کے ساتھ انھوں نے آف دی ریکارڈ بات کی تو میں نے انھیں یہ کہنے پر مجبور پایا کہ: ''اخلاقی اور نظریاتی اعتبار سے اگر کوئی قابل لحاظ قوت ایسی ہے جو مصر کو بچا سکتی ہے تو وہ صرف اخوان المسلمون ہے''۔

○ باطل کے مذموم عزائم: حسن البنا نے ایسے نامساعد حالات میں کام کیا، جب کہ: ایک طرف سامراجی طاغوت اور دوسری طرف مقامی اشرافیہ تھی (یہ مقامی اشرافیہ ہی غالب تعداد میں، سامراجی قوتوں کی آلۂ کار رہی ہے)۔ تیسری جانب وہ مہم جُو فوجی افسران تھے جنھوں نے اقتدار کا مزا چکھ لیا تھا۔ یہ مقتدر فوجی طبقہ ایک وسیع عالمی منظر نامے میں مغربی یا کمیونسٹ روسی سامراج کا آلۂ کار بنا۔ فوجی انقلابات کا یہ سلسلہ شرق اوسط سے شروع ہوا اور ۱۹۵۸ء میں پاکستان تک آ پہنچا۔ اپنی ہی قوم کو فتح کرنے کی اس فوجی لہر نے افریقہ کے نو آزاد ممالک کی بڑی تعداد کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ دراصل یہ حکمت عملی مغرب کے پیش نظر تھی، کہ جو ممالک آزاد ہو رہے ہیں وہ آزاد ہو کر بھی سامراجی قوتوں کے لیے چیلنج نہ بننے پائیں، اور کسی مثبت بنیاد کے بل بوتے پر نظریاتی یا معاشی و سیاسی قوت کا نیا مرکز نہ بن سکیں، اور اپنی معاشی، تجارتی، تہذیبی اور سیاسی پالیسیوں میں تابع مہمل بن کر رہیں۔

ان مقاصد کے حصول کے لیے اشترا کی عناصر نے اور امریکا اور اس کے حواریوں نے یہ کوشش کی کہ لوگوں کو خریدیں، معاشی مفادات کے جال میں پھنسائیں، سیاسی اور فوجی معاہدات کے ذریعے ان قوموں کو ایک نئی قسم کی غلامی میں جکڑ لیں۔ اس ہدف کے حصول کے لیے انھوں نے یہ اصول طے کیا کہ: ''فوجی قیادت ہی ہماری بہتر حلیف ہے۔ جو اپنے ملکوں میں بغاوت کر کے اقتدار پر شبخون مارے، اور ہماری مدد سے ہماری قائم مقام (proxy) بن کر ہماری مرضی پوری کرے''۔ کچھ رپورٹوں میں صاف لکھا ہے کہ مغرب زدہ گروہوں کے لیے اقتدار کی راہیں کشادہ کرنا خواہ یہ فوجی انقلاب اور استبدادی حکومت (despotic rule) کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو، مغربی اقوام کے قومی مفاد میں ہے، تاکہ مذکورہ ممالک کے عوام کو قابو میں رکھا جا سکے۔ مائلز کوپ لینڈ (Miles Copeland) جس نے عرب دنیا میں سفارتی ذمہ داریاں بھی ادا کیں اور وہ سی آئی اے کا ایجنٹ بھی تھا، اس کی یادداشتوں *The Game of Nations: The Amorality of Power Politics* (1970), اور *The Game Players Confessions* (1989) سے بھی اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔ مغربی پالیسی ساز اور سیاسی تجزیہ کار اب کھلے لفظوں میں اعتراف کرتے ہیں کہ: مسلم دنیا یا تیسری دنیا میں جو فوجی انقلاب آئے یا جو سیاسی اتھل پتھل

ہوتا رہا ہے، ان سب کے پیچھے کسی نہ کسی صورت میں امریکا اور اس کی ایجنسیوں کا ہاتھ تھا‘‘۔ مشرق وسطیٰ اس سامراجی چنگل سے کبھی نہیں نکل سکا۔

شام میں اخوان المسلمون کے سربراہ ڈاکٹر مصطفی سباعی [۱۹۱۵-۶۴ء] نے الفتح میں ایک مرتبہ لکھا تھا: [مسلم دنیا کی] سیاسی پارٹیاں ہر معاملے میں ایک دوسرے کی مخالف ہیں، مگر ایک نکتے پر ان کا اتفاق ہے، اور وہ ہے ’دین دشمنی‘___ اس لیے نظامِ حکومت میں تبدیلی کے سوا اصلاح کی کوئی صورت نہیں، اور نظامِ حکومت کی تبدیلی کا دارومدار ہے معاشرے کی تبدیلی پر۔ افسوس کہ علماے کرام اس بات کو نہیں سمجھتے‘‘۔ میں اس میں یہ اضافہ کروں گا، کہ ’دین دشمنی‘ کی اس روش میں فوجی قیادتوں اور سیاسی طالع آزماؤں کو عالمی سامراجی قوتوں کی بھرپور سرپرستی حاصل رہی ہے۔ صد افسوس اس بات پر کہ اپنی قوم کے مفادات سے بے وفائی کا ارتکاب کرنے میں یہ طبقہ ادنیٰ درجے کی شرم تک محسوس نہیں کرتا، اور سامراجی آقاؤں کے سامنے اپنی قومی اور ذاتی ذلت تک کو خوشی خوشی برداشت کرلیتا ہے، بلکہ اس توہین کو بھی اعزاز کی کوئی قسم تصور کرتا ہے۔

اس منظرنامے میں حسن البنا اور اخوان المسلمون نے دعوت، تنظیم اور تربیت کا کام شروع کیا۔ وہ بہ یک وقت عالمی سامراج اور سامراج کے مقامی آلۂ کاروں کے سامنے چٹان بن کر کھڑے ہوگئے۔ انھوں نے، دین کی گمراہ کن اور معذرت خواہانہ تعبیر کرنے والوں اور معاشرے میں سماجی، معاشرتی، اور سیاسی ظلم کی تمام بنیادوں کو پوری قوت سے چیلنج کیا۔ اس کے لیے اخوان نے جو راستہ اختیار کیا، اس میں تنظیم اور صحافت کے ساتھ ساتھ سیاست میں کھلے بندوں حصہ لینا بھی شامل تھا۔ حسن البنا نے خود بھی الیکشن میں حصہ لیا، اور اگر برطانوی اور مصری حکومت ان کا راستہ نہ روکتی تو وہ بڑی عظیم اکثریت سے کامیاب ہوتے۔

ان پابندیوں اور تمام تر مشکلات کے باوجود حسن البنا نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ افراد سے رابطے کا طریقہ تھا۔ یہی وہ امتیاز ہے جس نے استبداد کے اندھے بہرے ظلم اور اپنی بات کہنے کے کھلے مواقع نہ ہونے کے باوجود گھر گھر، محلے محلے، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ اس دعوت کو پہنچا دیا۔ اسی لیے ساری پابندیوں کے باوجود آج بھی اخوان ایک اہم سیاسی اور نظریاتی قوت کے طور پر موجود ہیں، بلکہ ملک کی پارلیمنٹ میں مضبوط حزب اختلاف کا درجہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ اخوان کی

تنظیم خلاف قانون ہے، اور اخوان کے وابستگان نے آزاد امیدواروں کی حیثیت سے انتخابات میں حصہ لیا۔ اخوان کی اس طلسماتی قوت کا ثبوت ہر موقع پر نظر آتا ہے۔ اس چیز کا گہرا تعلق حسن البنا کی شخصیت اور ان کے اس طریقۂ کار سے ہے، جس میں تنظیم پر پابندی کے باوجود خودکار پھیلاؤ اور نچلی سطح تک ان کی رسائی ممکن ہوئی۔ یہ ان کی قوت کا بڑا راز اور بہت بڑا خزانہ ہے۔

○ اخوان کی قوت کا راز: سعید رمضان کے ذریعے ہم نے اس راز کو سمجھنے کی کوشش کی۔ تب ہم نوجوان تھے اور اسلامی تحریکی لٹریچر کا تازہ تازہ مطالعہ کیا تھا۔ اسلام کی ہمہ گیر انقلابیت کا جذبہ پوری طرح دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا (الحمدللہ، آج بھی وہی کیفیت ہے، البتہ ماہ و سال کی رفت و گذشت کے سبب قوت کار کم رہ گئی ہے)۔ ہم یہ معلوم کر کے بہت خوش تھے کہ جو بات مولانا مودودی نے مغربی طاغوت کی روح اور فطرت کے بارے میں کہی ہے، اور جو بات مولانا نے اسلام کے انقلاب اور پورے نظام کی تبدیلی کے حوالے سے ارشاد فرمائی ہے، بالکل وہی بات حسن البنا نے بھی اپنے خطبات میں کہی ہے۔ اس طرح نصب العین اور حصولِ منزل کی جدوجہد میں ہم اور اخوان ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔

تاہم ایک پہلو میں ہمیں کچھ فرق محسوس ہوتا تھا۔ اخوت اور محبت کا ویسا کلچر ہمارے ہاں اس طرح فروغ نہیں پاسکا، جس طرح اخوان کے یہاں نظر آتا ہے۔ اس کا ایک چھوٹا سا مظاہرہ روزمرہ کے میل جول میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے اہل حل وعقد جب ہم سے ہاتھ ملاتے تو ان کے ہاتھ کی گرفت میں ذاتی تعلق کا اس درجہ اظہار نہیں محسوس ہوتا تھا، جیسا اخوان کے بڑے اور چھوٹے ہر بھائی سے ملتے وقت محسوس ہوتا۔ ممکن ہے اس میں ہمارے خطے کی آب و ہوا، کلچر اور رسم و رواج کا بھی اثر ہو۔ اخوان کے ہاں اللہ کی خاطر محبت کے تصور کو بڑا مرکزی مقام حاصل ہے۔ خود جماعت اسلامی کے تربیتی لٹریچر میں اس موضوع سے متعلق احادیث کا ایک مؤثر انتخاب موجود ہے، لیکن اپنائیت کے اس تصور کو وہ اہمیت اور مرکزیت اس درجے میں حاصل نہیں ہوسکی، جو اخوان کے ہاں نظر آئی۔ اللہ کی خاطر محبت ہم نے اخوان کے احباب سے سیکھی۔ یہ سیکھا کہ اللہ کی خاطر بندوں کے درمیان تعلق کی بنیاد کو کس طرح مضبوط بنایا جاسکتا ہے اور پھر جب اخوان کے لٹریچر کو پڑھا تو اس میں بھی اسی اسپرٹ کو رچا بسا پایا۔ اخوان کے جتنے بھی کارکنوں سے

ہمیں ملنے کا موقع ملا، ان میں اسی جذبے اور حرارت کی فراوانی پائی۔ حسن البنا کی زندگی کا مطالعہ کیا تو ان کی زندگی کے اندر بھی یہی کیفیت موجزن دیکھی۔ غالباً 'محبت فاتح عالم' والی کیفیت اور اس سے رونما ہونے والی مقناطیسی قوت ہے، جس کے ادراک نے ان سے اس تحریک کا نام اخوان المسلمون رکھوایا (پیش نظر رہنا چاہیے کہ تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی 'اخوان الصفا' سے اخوان المسلمون کا کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ خالص قرآنی اخوت سے اس کا رشتہ ہے)۔ یہ چیز ہمیں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی تھی۔

اسی طرح ہم نے اخوان کے تربیتی نظام سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ اس زمانے میں مولانا عبدالغفار حسن [م: ۲۲ مارچ ۲۰۰۷] جماعت اسلامی میں شعبہ تربیت کے ذمہ دار تھے۔ درس قرآن، درس حدیث، سیرت اور لٹریچر، جماعت کے تربیتی نظام کے عناصر ترکیبی تھے۔ اجتماع ارکان میں ان چیزوں کی باقاعدگی کے ساتھ احتساب کا اہتمام بھی تھا۔ روحانیت اور ربانیت، اخوان کے دو نہایت مرکزی پہلو ہیں۔ جمعیت میں ہم نے اخوان سے یہ سیکھا تھا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں روحانی بالیدگی کے لیے شب بیداری بھی ایک مؤثر تربیتی پروگرام ہے۔ اس سے قبل جماعت اور جمعیت کے پروگراموں میں شب بیداری نہیں ہوتی تھی۔ یوں جمعیت اور جماعت میں بھی شب بیداری کا پروگرام متعارف ہوا۔

○ نظام الاسرہ اور اس پر اختلاف: حسن البنا نے دعوت، تنظیم اور تربیت کے آغاز ہی میں خداداد صلاحیت کی بنا پر اس خطرے کو بھانپ لیا تھا کہ آنے والے کل میں، اس راستے پر چلنے والے جاں نثاروں کو کن مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔ دعوت، تحریک اور آزمایش، لازم و ملزوم ہیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے انھوں نے کہا: بہترین طریقہ یہ ہے کہ افراد کو جوڑ کر اس طرح سے چھوٹے چھوٹے گروپ بنا دو کہ ریاستی جبر کے نتیجے میں اخوان کا مرکزی نظم رہے یا نہ رہے، مگر تنظیم کا یہ بنیادی یونٹ اپنی جگہ کام کرتا رہے۔

ایسے نظریاتی حلقے کی حد ۱۰ فراد پر قائم کی، جسے 'اسرہ' کہتے تھے۔ جب ۱۰ افراد پورے ہوجاتے تو انھیں دو 'اسروں' میں تقسیم کر دیتے۔ اس طرح انھوں نے ہزاروں حلقوں کی صورت میں نظام قائم کیا۔ اس نظام اسرہ میں سب سے زیادہ دل چسپ چیز اس کا اجتماعی مطالعے کا نظام ہی

نہیں تھا، بلکہ اس میں عبادات بھی مشترک تھیں اور شب بیداریاں بھی۔ میرے نزدیک 'نظام اسرۃ' میں سب سے اہم چیز یہ تھی کہ اس کے ممبران ایک دوسرے کی خوشیوں اور غموں میں پورے شعور اور وابستگی سے شرکت کریں۔ ایک دوسرے کا سہارا بنیں۔ کسی ایک ساتھی پر کوئی مصیبت آئے تو 'اسرۃ' کے تمام ساتھی اس کی مدد کو پہنچیں۔ یہی اسرہ کا مرکزی اصول تھا: پاکیزہ، ہمدرد اور بےلوث برادری۔

بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ اخوان کی بقا کا بڑا انحصار اس 'نظام اسرۃ' پر رہا۔ اس کے ثمرات میں سے بہت متاثر کن چیز آزمایش اور ابتلا میں ان کی استقامت تھی۔ صدر ناصر کے زمانے میں صرف مصر میں ۳۰ سے ۴۰ ہزار افراد جیلوں میں تھے اور بیش تر شدید تعذیب کا نشانہ بنائے گئے تھے۔ ان سخت آزمایشوں اور ابتلا کے ادوار سے گزرنے کے باوجود انھوں نے الحمدللہ، جس تقویٰ اور استقامت کا ثبوت دیا ہے، وہ پختہ ایمان اور اس 'نظام اسرۃ' کی برکات کا عملی اظہار تھا، کہ جس نے لوگوں کو آپس میں جوڑ دیا تھا۔ اسی 'نظام اسرۃ' نے قیدی ساتھیوں کے خاندانوں کی دست گیری، عملی مدد اور ہمت بندھانے میں معاونت کی ہے۔

سعید رمضان سے 'نظام اسرۃ' سمجھ کر ہم نے اسلامی جمعیت طلبہ میں اس کو اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ جمعیت کی تنظیم کو جو اسکولوں، کالجوں، یونی ورسٹیوں کے کارکنوں پر مشتمل تھی، اسے علاقائی اور رہایشی بنیاد پر کام کے لیے منظم کیا، جو اسرے ہی کی ایک شکل تھی۔ اس وقت کی جمعیت کے ناظم اعلیٰ کو کچھ دیگر امور کے ساتھ اس پر بھی شدید اضطراب ہوا۔ وہ پریشان تھے کہ ہماری تحریک کے روایتی نظام میں یہ ایک نئی چیز آگئی ہے۔ بالآخر ہمیں اس نظام میں کچھ تبدیلیاں کرنا پڑیں۔ اس طرح ہمارا رہایشی نظام تو باقی رہا، لیکن 'نظام اسرۃ' اپنے اخوانی تصور کے مطابق ہمارے تنظیمی نظام کا حصہ نہ بن سکا۔ یوں کراچی جمعیت میں 'نظام اسرۃ' محض چار پانچ سال تک ہی چلا۔ یہاں پر یہ تذکرہ بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ جب جمعیت میں 'نظام اسرۃ' پر بحث اٹھی، ان دنوں مولانا مودودی جیل میں تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی (م: دسمبر ۱۹۹۷ء) کا رجحان اسرے کے حق میں نہیں تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ یہ نوجوانوں کی محض ایک اپچ ہے اور بس۔ مگر انھوں نے کھل کر اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ اس زمانے میں ہمیں جمعیت میں بڑی آزمایش اور نازک مرحلے سے

گزرنا پڑا۔

اللہ تعالیٰ کی رحمتیں ہوں ہمارے ان بزرگوں پر جنھوں نے اس دورآزمایش میں نوجوانوں کی راہ نمائی فرمائی اور جمعیت انتشار سے بچ گئی۔اس سلسلے میں محترم شیخ سلطان احمد صاحب ، چودھری رحمت الٰہی صاحب اور چودھری غلام محمد صاحب کا کردار اہم تھا۔ انھوں نے ہمارے اس داخلی قضیے کوسلجھایااور یہ کہا کہ کراچی جمعیت کے اس تجربے کوہم اسلام اورتحریک کے مزاج کے خلاف یا روایات سے متصادم نہیں پاتے۔اس طرح ہمیں تائید حاصل ہوئی،اور اس بحث پر جومقدمہ بنا تھا وہ قبول نہیں کیا گیا۔

○ ہجرت اور دعوت کا ثمر: جس زمانے میں مصر میں اخوان ابتلا سے گزرے، انھوں نے اپنی ابتلا کی مدت کوقصۂ زمین، برسرزمین سمجھ کرحالات کا سامنا کیا۔ بعد میں جب موقع ملا تو ان میں سے کچھ لوگ سعودی عرب،کویت یا خلیجی ممالک چلے گئے۔کچھ افراد امریکا، جرمنی، انگلستان کی طرف جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔اسلام کے ان نہایت قیمتی سپوتوں نے مغربی دنیا میں دعوت اسلام کی بھاری ذمہ داری سرانجام دینے کے لیے بڑی ٹھوس بنیادیں استوار کیں۔آج مغربی دنیا میں اشاعت اسلام کے بیش تر سرچشموں کے پیچھے روایتی مذہبی طبقوں سے کہیں زیادہ اخوان کے ان جلاوطن کارکنوں کی پرخلوص حکمت اور مساعی کارفرما ہے۔

اخوان میں ایک اور وصف بڑا متاثر کن اورقابل رشک ہے،اور وہ ہے ان کا اللہ سے تعلق کے ساتھ ساتھ قرآن سے ربط۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اخوان اور قرآن لازم وملزوم بن گئے ہیں۔اس باب میں میرا سب سے دل چسپ تجربہ وہ تھا، جب میں محترم میاں طفیل محمد کے ساتھ صدرحسنی مبارک سے ملنے مصر گیا تو ان لوگوں نے ہمارے لیے نہرسویز کی سیر کا انتظام کیا تھا۔ہم رات کے ۱۲ بجے سویزنہر کی سیر کے لیے نکلے اورفجر سے کچھ پہلے واپس آئے۔ وہاں ہوتا یہ ہے کہ جہازسویز کے درمیان میں کمان تبدیل کرتا ہے۔ایک جہاز ایک طرف سے آتا ہے اور دوسرا جہاز دوسری طرف سے۔ جب کمان تبدیل ہورہی تھی تو جس جہاز میں ہم تھے، اس کا ایک اعلیٰ کمانڈر ہم سے ملا۔ جب اس سے میاں صاحب، جماعت اور میرا تعارف ہوا،تو اس نے احترام اوراپنائیت کے اظہار کے لیے آہستگی سے اپنی جیب سے قرآن نکالا اور ہمیں ہدیہ کردیا۔ یہ اشارہ

تھا اس بات کا کہ میرا تعلق اخوان سے ہے۔ حالانکہ خفیہ سروس کے لوگ ہمیں گھیرے ہوئے تھے۔ یہ واقعہ غیر محسوس انداز میں ہوا۔

○ سماجی اور معاشی فکر: معاشرتی تشکیل کی فکر اور وژن کے موضوع پر مولانا مودودی اور اخوان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا، تاہم پروگرام کے نفاذ کی تفصیلات میں کچھ امور پر ایک حد تک اختلافِ رجحان کا احساس ہوتا ہے۔ اخوان کے یہاں شروع ہی سے دعوت، سیاست، خدمت اور متبادل اقتصادی بنیاد تعمیر کرنے کی فکر ساتھ ساتھ موجود رہی ہے۔ اخوان نے غربت کو ختم کرنے اور روزگار فراہم کرنے کی اسکیم ۱۹۴۳ء میں شروع کی تھی۔ اداراتی (انسٹی ٹیوشنل) مناسبت سے ان کے ہاں معاشی مسائل اور سامراج سے چھٹکارا پانے کا نظامِ کار نمایاں طور پر متحرک دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے ہاں کام کا آغاز ایمان، عقیدے اور دینی وژن سے ہوتا ہے۔ پھر ہم آہستہ آہستہ مذکورہ اداراتی اور سماجی مسائل کی طرف آتے ہیں۔ البتہ شعوری طور پر، آئینی مسائل ہمارے ہاں مرکزیت کے حامل رہے ہیں، جن کو دنیا بھر کی اسلامی تحریکیں قابل تقلید اقدام تسلیم کرتی ہیں۔ مگر دوسری جانب معاشی اور معاشرتی مسائل پر ایک متوازن اور متناسب انداز سے ہماری توجہ مرکوز نہیں رہی، اس کمی کا مداوا کم از کم مستقبل میں ضرور ہونا چاہیے۔ میں نے اس سلسلے میں جو ہاتھ پاؤں مارنے کوشش کی ہے، ان مساعی میں مجھے مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور چودھری غلام محمد [م:۱۹۷۰ء] کی خصوصی مدد اور راہ نمائی حاصل رہی ہے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ ایمان، عقیدے اور اخلاق کی مرکزیت اور دینی روح کے ساتھ سماجی اور معاشی میدان میں تحریک کے انقلابی پروگرام کو کلیدی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ مگر یہ کام نعروں کی سطح پر نہیں، بلکہ تسلسل اور ایک ایسے اسلامی فریم ورک کے ساتھ ہونا چاہیے، جو عصری تقاضوں کو بھی پورا کرنے کا بھرپور اہتمام کرے۔ سماجی و معاشرتی مسائل میں اخوان کی متوازن دل چسپی قابل رشک ہے۔ البتہ ان کے ہاں افراط و تفریط کے بعض مناظر بھی نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر مصطفی سباعی نے تو اشتراکیت فی الاسلام تک کی بات کہہ دی تھی، تاہم اسے اخوان کے مجموعی ذہن نے قبول نہیں کیا۔

اس کے برعکس جماعت اسلامی، عورتوں کے ووٹ کے حق اور خاص طور پر اجتماعی معاملات اور تحریکی نظام میں خواتین کی شرکت کے حوالے سے، اخوان سے بہت آگے تھی۔ عورتوں کے ووٹ کے حق کو اخوان نے ۱۹۵۰ء کے عشرے میں تسلیم کیا، مگر جماعت اسلامی نے شروع ہی سے اس کو تسلیم کیا تھا، بلکہ مولانا مودودی نے تو یہاں تک لکھا کہ عورتوں کی الگ شوریٰ ہو جو معاملات پر آزادانہ انداز میں غور وفکر کرے۔ اخوان اور جماعت میں پائے جانے والے ایسے جزوی اختلافِ رائے کا تعلق نفاذ دین کی تفصیلات سے ہے، وژن اور تصور سے نہیں۔

○تشدد کے الزام کی حقیقت: ایک طرف تاریخ میں اخوان پر ابتلا و آزمایش کے دور باربار آئے۔ دوسری طرف خود انصاف اور قانون کا خون کر کے اقتدار پر ناجائز قبضہ کرنے اور اپنے ہی ہم وطنوں کا خون بہانے والے نام نہاد روشن خیال طبقے نے الٹا اخوان ہی کو تشدد پسند کہہ کر انھیں الزامی مہم کا نشانہ بنایا۔ افسوس کہ ہمارے یہاں لبرل طبقے کی لبرلزم کا حدود اربعہ بس اتنا ہے کہ مغرب کی اندھی تقلید کی جائے۔ انھیں جمہوریت، انسانی حقوق، قانون کی حکمرانی اور عدل وغیرہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔

اقتدار، وسائل، طاقت، قومی اقتدار، مادی وسائل، عسکری طاقت اور ذرائع ابلاغ پر قابض اس طبقے کے بارے میں ایک مرتبہ مولانا مودودی نے فرمایا تھا کہ یہ ایسے پہلوان ہیں جو مدمقابل کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس سے کشتی لڑنے کے لیے میدان میں اُترتے ہیں۔ اس طبقے نے ایک طرف اخوان کو نشانہ بنایا، تو دوسری جانب پاکستان میں مولانا مودودی کو قید کر کے یہ کہنا شروع کیا کہ اخوان، تشدد پسند ہیں اور جماعت اسلامی کا تعلق بھی اخوان سے ہے۔ اخوان سے کوئی تنظیمی تعلق نہ رکھنے کے باوجود جماعت نے اخوان کے خلاف بدنیتی پر مبنی اس پروپیگنڈے کی مخالفت کی، اور اخوان کے دفاع میں کبھی کوتاہی نہیں برتی۔ اخوان پر مظالم کے خلاف اور ان کی تائید وحمایت میں، ہم نے ہر پلیٹ فارم پر، تحریر اور تقریر میں آواز بلند کرنے کی کوشش کی ہے، مگر تصادم اور ٹکراؤ پر منتج ہونے والے ایجی ٹیشن کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ جماعت کو اس بارے میں ہمیشہ شرح صدر رہا ہے کہ مؤثر، باوقار اور نصیحت کے انداز میں بات زیادہ پُراثر ہوتی ہے۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ اخوان نے کبھی اپنی حکومتوں کا تختہ الٹنے کے لیے طاقت یا زیر

زمین روابط کو استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اخوان کے ہاں قوت مجتمع کرنے کی سوچ، فلسطین پر قبضے کے خواہاں یہودیوں اور یورپیوں کی سامراجی یلغار کو روکنے کا سرعنوان تھی۔ اگرچہ ایک دو مواقع پر چند غیر ذمہ دار نوجوانوں کی نامناسب انفرادی حرکتیں انھیں دلدل میں دھکیلنے کا ذریعہ بنیں، لیکن ان کی تاریخ کے گہرے مطالعے کی بنا پر میں یہ بات برملا کہہ سکتا ہوں کہ قوت کے استعمال کے حوالے سے ان پر عائد الزامات میں بہت کچھ محض زیب داستان کی حیثیت رکھتا ہے۔

مناسب ہوگا کہ اخوان کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کے لیے یہاں پر امام حسن البنا کے اس مشہور خطبے پر غور کیا جائے، جو انھوں نے ۱۹۳۸ء میں اخوان کے پانچویں اجلاس میں دیا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا: ''اخوان، فکروعمل کی سطحیت پر ریجھ جانے والے نہیں ہیں، بلکہ وہ گہری فکر اور وسیع زاویۂ نظر کے حامل ہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی چیز کی گہرائیوں میں ڈوب کر نہ دیکھیں...... وہ جانتے ہیں کہ قوت کے مدارج کیا ہیں: ان میں اولیت، عقیدہ و ایمان کی قوت کو حاصل کرنا ہے۔ اس کے بعد وحدت و ارتباط کی قوت کا حصول ہے، اور ان دونوں کے بعد زورِ بازو کا درجہ آتا ہے...... الاخوان، متشددانہ انقلاب کے بارے میں قطعی طور پر کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتے۔ وہ کسی حال میں اس طریق کار پر اعتماد نہیں کرتے، اور نہ اس کا نفع بخش اور نتیجہ خیز ہونا انھیں تسلیم ہے...... تاہم اگر حالات کی رفتار یہی رہے گی اور اصحابِ اقتدار اس کا علاج نہیں سوچیں گے، تو اس کا لازمی نتیجہ متشددانہ انقلاب کی صورت میں ظاہر ہوگا، لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ اس میں اخوان کا ہاتھ ہوگا، بلکہ یہ حالات کے دباؤ اور اصلاح سے گریز کا لازمی نتیجہ ہوگا۔ ضرورت یہ ہے کہ ہماری قومی زندگی کے سیاہ وسفید پر قابض طبقے اپنی ذمہ داری اور صورت حال کی نزاکت کو سمجھیں''۔

جماعت اسلامی پاکستان نے اپنے دستور کی دفعہ ۵ (۴) میں واضح طور پر اعلان کیا ہے: ''جماعت اپنے نصب العین کے حصول کی جدوجہد، خفیہ تحریکوں کی طرز پر نہیں کرے گی، بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کرے گی''۔ اس طرح جماعت نے ہمیشہ کے لیے دوسرے دروازے کو بند کر دیا۔ پھر اسی طرح جماعت اسلامی پاکستان نے ستمبر ۱۹۴۸ء کو مرکزی مجلس شوریٰ میں یہ قرارداد منظور کی تھی کہ: ''اپنے مقصد کے حصول کے لیے جماعت اسلامی ایسے ذرائع اور طریقوں کا استعمال جائز نہیں سمجھتی' جو صداقت اور دیانت کے خلاف ہوں یا جن سے بدنظمی اور بدامنی رونما ہو۔ جماعت

اسلامی، اصلاح و انقلاب کے لیے جمہوری طریقوں پر یقین رکھتی ہے، یعنی تبلیغ و تلقین کے ذریعے سے اذہان اور سیرتوں کی اصلاح کی جائے اور راے عام کو ان تغیرات کے لیے ہموار کیا جائے، جو ہمارے پیش نظر ہیں۔ جماعت کا کوئی کام خفیہ نہیں ہے بلکہ سب کچھ علانیہ ہے۔ جن قوانین پر ملک کا نظم و نسق اس وقت چل رہا ہے ان کو وہ توڑنا نہیں چاہتی، بلکہ اسلامی اصولوں کے مطابق بدلنا چاہتی ہے"۔

مولانا مودودی نے ۱۹۶۳ء میں، مسجد ابراہیم، مکہ معظمہ میں عرب نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا: "[دنیا بھر میں] اسلامی تحریک کے کارکنوں کو میری آخری نصیحت یہ ہے کہ انھیں خفیہ تحریکیں چلانے اور اسلحے کے ذریعے انقلاب برپا کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی دراصل بے صبری اور جلد بازی ہی کی ایک صورت ہے، اور نتائج کے اعتبار سے دوسری صورتوں کی بہ نسبت زیادہ خراب ہے۔ ایک صحیح انقلاب ہمیشہ عوامی تحریک کے ذریعے سے برپا ہوتا ہے۔ کھلے بندوں عام دعوت پھیلایئے، بڑے پیمانے پر اذہان اور افکار کی اصلاح کیجیے، اور اس کوشش میں جو خطرات اور مصائب بھی پیش آئیں، ان کا مردانہ وار مقابلہ کیجیے۔ اس طرح بتدریج جو انقلاب برپا ہوگا، وہ ایسا پایے دار اور مستحکم ہوگا جسے مخالف طاقتوں کے ہوائی طوفان محو نہ کرسکیں گے۔ جلد بازی سے کام لے کر اگر کوئی انقلاب رونما ہو بھی جائے گا تو جس راستے سے وہ آئے گا، اسی راستے سے وہ مٹایا بھی جاسکے گا"۔ (دیکھیے: ماہ نامہ ترجمان القرآن، جون ۱۹۶۳ء)

مولانا مودودی پہلی بار ۱۹۵۶ء میں عالم عرب گئے تھے، لیکن ان سے پہلے مولانا مسعود عالم ندوی نے ۱۹۴۹ء میں بلاد عرب کا دورہ کیا تھا۔ مسعود عالم صاحب نے اپنے ایمان افروز سفرنامے دیارِ عرب میں چند ماہ میں یکم جولائی ۱۹۴۹ء کو لکھا تھا: "جس شخص پر اخوان سے تعلق کا ادنیٰ شبہہ بھی ہوتا ہے، اسے فوراً قید کرلیا جاتا ہے۔ حیرت ہے، حکومت کی فوج اور پولیس کے سامنے، اسلام اور مصر کے دشمن قاہرہ کی سڑکوں پر اکڑتے پھرتے ہیں، لیکن مصری حکومت ان کے خلاف کچھ نہیں کرتی۔ اس کا سارا غیظ و غضب اسلام کے داعیوں پر ٹوٹتا ہے"۔ پاکستان آکر مولانا مسعود عالم ندوی نے مختلف تربیتی پروگراموں میں اخوان کے بارے میں جو تاثرات بیان کیے، ان میں اخوان سے محبت، اخوان سے قربت، اخوان سے عقیدت اور اخوان کو اپنا دست و بازو سمجھنے

کا پہلو غالب تھا۔ بعدازاں خود مولانا مودودی نے کئی بار اس بات کا اظہار فرمایا کہ: ''فکری اعتبار سے جو کام ہم کر رہے ہیں، وہی کام اخوان کر رہے ہیں۔ ہمارے درمیان بنیادی نقطۂ نظر کا کوئی مسئلہ نہیں ہے''۔

○ امام شہید کے رفقا: یہ واقعہ بھی تاریخی نوعیت کا ہے کہ جب مصری حکومت نے اخوان پر پابندی لگائی تھی، تو عبدالقادر عودہ شہید [۱۹۰۶ء-۱۹۵۴ء] ہائی کورٹ کے جج تھے۔ پابندی کے خلاف مقدمہ چلا، مگر عدالت نے اخوان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ جس عدالت نے فیصلہ دیا، اس کے جج عبدالقادر عودہ بھی تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ: ''مجھے تاریخ نے اخوان پر حَکَم [جج] بنایا اور بالآخر میں اخوان ہی کا ہو گیا''۔ اپنی مشہور کتاب التشریع الجنائی فی الاسلام انھوں نے اخوان کی دعوت قبول کرنے کے بعد لکھی۔

بعدازاں جب میں کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ معاشیات میں پڑھا رہا تھا، اس زمانے میں سید قطب ہمارے لیے فکروعمل کی ایک بڑی مؤثر علامت اور ہمارے ہیرو تھے۔ افسوس ہے کہ مجھے سید قطب سے بھی ملنے کا موقع نہیں ملا، لیکن ان کی جان دار تحریروں اور علمی طور پر نہایت وقیع نگارشات سے بھرپور استفادے کی کوشش کی ہے۔ سب سے بڑھ کر حق کی راہ میں ان کی استقامت میرے لیے ہی نہیں، ہماری پوری نسل کے لیے روشنی کا مینار ثابت ہوئی ہے۔ سید قطب کو ناصر نے قید میں ڈالا اور اس طرح مقدمہ چلایا کہ انھیں وکیل تک نہ کرنے دیا۔ سوڈان سے دو چوٹی کے وکیل احمد امین سالک اور محمد احمد دورابی، فروری ۱۹۶۶ء میں قاہرہ پہنچے تو انھیں دھکے دے کر مصر سے نکال دیا گیا۔ اس طرح سید قطب نے تن تنہا بڑی جرأت اور استقامت سے مقدمے کا سامنا کیا۔ آخرکار ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء کو مفسر قرآن، مفکر اسلام، اعلیٰ پائے کے ادیب اور دانش ور سیّد قطب کو پھانسی دے دی گئی۔

اخوان کے قائدین میں، میرا سب سے زیادہ گہرا تعلق استاد مصطفی مشہور سے تھا۔ وہ متعدد بار پاکستان میں ہمارے مہمان رہے، خصوصاً افغانستان کے جہاد کے زمانے میں۔ اس کے علاوہ ان سے میری ملاقاتیں انگلستان، مصر، جرمنی اور ترکی میں بھی رہیں۔ ہم نے دعوت دین کے کاموں میں تبادلۂ خیال کے لیے ایک مشاورت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کوششوں کے وہ سربراہ تھے

اور میں ان کا نائب تھا۔حسن البنا کی زندگی میں مصطفی مشہور نوجوانوں کے گروپ کے سربراہ تھے۔ اسی طرح مامون الہضیبی سے بھی مصر اور یورپ میں تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ان تمام مواقع پر اشتراک اور افہام وتفہیم کا پہلو غالب رہا۔البتہ حکمت عملی میں کبھی کبھار ترجیحات کے بارے میں اختلاف رائے بھی پیدا ہوا۔ جماعت کے نظام تربیت کو انھوں نے سمجھنے کی کوشش کی۔ اخوان کے قائدین کو یہ احساس تھا کہ فکری میدان میں ہمارا [یعنی جماعت کا] کام ان سے بہتر ہے۔ہم نے کشمیر کے مسئلے کو تمام تفصیلات کے ساتھ واضح کیا اور اخوان نے اس مسئلے پر پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا۔اسی طرح فلسطین کے مسئلے کے سب سے مؤثر داعی اخوان تھے اور ہم نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔

○ آرا میں اختلاف: جب سعید رمضان یہاں پاکستان میں تھے تو ان کی خواہش تھی کہ جماعت اسلامی کی موجودگی کے باوجود پاکستان میں ایک حلقہ ایسا بھی قائم کیا جائے جو براہ راست اخوان سے متعلق ہو۔اس مقصد کے لیے انھوں نے 'الاحباب' کے نام سے تنظیم بنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ چودھری غلام محمد صاحب اور میرے سمیت، جمعیت کے رفقا نے ان سے تفصیلی بات چیت کی اور بتایا کہ ایسا کوئی بھی متبادل یا متوازی نظام یہاں قائم ہوا تو وہ اس مقصد کے لیے مجموعی طور پر مفید نہیں ہوگا۔ ہمارا یہ اختلاف نظریاتی نہیں بلکہ حکمت عملی کا تقاضا تھا۔

ایک مسئلہ متعدد بار اخوان کی طرف سے اٹھایا گیا تھا کہ ہم سب مل کر عالمی سطح پر تنظیم کا ایک ڈھیلا ڈھالا وفاق قائم کریں، لیکن ہم نے اس تجویز کی تائید نہیں کی، اور ان کے سامنے یہ بات رکھی کہ موجودہ حالات میں حسب ضرورت آپس میں مل کر تبادلۂ خیالات سے آگے ہمیں نہیں بڑھنا چاہیے۔اس کی دو وجوہ ہیں: پہلی یہ ہے کہ عالمی حالات کے پیش نظر کچھ رفاہی منصوبوں میں تعاون تو درست ہوسکتا ہے، لیکن اس سے زیادہ ربط وتعلق موجودہ عالمی اور خود مسلم ممالک کے سیاسی حالات کی وجہ سے نہ ممکن ہے اور نہ مفید۔دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان ممالک میں کسی جگہ تحریک اسلامی پر پابندی ہے اور ان کے خلاف ریاست قوت استعمال کر رہی ہے۔ کہیں کچھ نرمی ہے اور پناہ مل رہی ہے۔اگر آپ ایک نظم بن جائیں گے تو بین الاقوامی ریاستی تعلقات میں مسائل پیدا ہوں گے اور حکمرانوں کو تحریک اسلامی کے خلاف کام کرنے میں زیادہ قوت حاصل ہوجائے گی اور وہ اس کے خلاف زیادہ مؤثر اقدام کریں گے۔ البتہ اگر ہر ملک میں آزاد نظم رہے اور واحد

مرکزیت سے گریز کیا جائے تو یہ تحفظ کا ذریعہ ہوگا۔ اسی لیے ہم نے کوئی بین الاقوامی تنظیم نہیں بنائی۔

یہ دُوراندیشی دراصل مولانا مودودی کی بصیرت کا مظہر ہے۔ البتہ کسی مسئلے پر مشترکہ موقف اختیار کرتے ہوئے متفقہ نقطۂ نظر بیان کرنا مختلف چیز ہے۔ اس کے لیے وقتاً فوقتاً دوسرے پلیٹ فارم موجود ہیں۔ ایسے پروگراموں میں اسلامی تحریکات کے ذمہ داران نے شرکت کرکے اس مقصد کو تقویت دی ہے، اور کوشش یہ رہی ہے کہ آپس میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی رہے۔ یہ سوچ پوری دنیا میں اسلامی تحریک کے لیے مفید رہی ہے۔

۱۹۸۲ء میں، قاہرہ میں مصر کے صدر حسنی مبارک سے ہم نے انھی کی دعوت پر ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات میں ہم نے یہ کہا تھا: ''اُمت کا مفاد اسی میں ہے کہ ریاستی قیادت اور تحریک اسلامی تصادم کے بجاے افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کریں، اور اگر تعاون ممکن نہیں تو ایک دوسرے کی پوزیشن کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر بقاے باہمی (co-existence) کا راستہ اختیار کریں۔

۷۰ کے عشرے میں، جب لیبیا میں اخوان پر پابندی نہیں تھی، ڈاکٹر شریف جو صدر قذافی کی کابینہ میں شامل تھے اور ڈاکٹر محمد یوسف مغائریف جو لیبیا کے آڈیٹر جنرل تھے، ان حضرات کے توسط سے مجھے پیش کش کی گئی تھی کہ میں لیبیا میں معاشی مشیر بن کر آجاؤں، لیکن میں نے معذرت کی۔ پھر جلد ہی اندازہ ہوگیا کہ اخوان اور لیبیا کے مطلق العنان حکمرانوں کا راستہ الگ ہے۔ اسی طرح سعودی عرب کے ذمہ داران سے اخوان کے بارے میں بار بار گفتگوئیں ہوئی ہیں۔ اُردن میں شہزادہ حسن بن طلال سے کئی بار میری ملاقات میں اخوان کے معاملے پر بات ہوئی ہے۔ ان تمام ملاقاتوں میں ہم نے کبھی بھی تحریک کی عزت اور وقار پر مصلحت آمیزی کا راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ نصیحت اور تلقین کا راستہ اختیار کیا۔

۱۹۹۰ء میں، جب عراق نے کویت پر قبضہ کیا تو دنیا بھر سے اسلامی تحریکوں کے قائدین نے عالم عرب کا دورہ کیا۔ اس وفد میں محترم قاضی حسین احمد، ڈاکٹر نجم الدین اربکان، ڈاکٹر حسن ترابی اور اخوان المسلمون اُردن کے عبدالرحمن خلیفہ شامل تھے۔ مجھے بھی اس وفد میں شرکت کا شرف حاصل ہے۔ ہم نے عراق، اردن، سعودی عرب، اور ایران کا دورہ کیا، اور وہاں پر چوٹی کی

قیادت سے ملاقاتیں کیں۔ اس دورے میں عراقی سربراہ صدام حسین سے بھی ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ اس گفتگو کا محور جنگ تھا۔ صدام حسین سے قاضی حسین احمد صاحب نے بڑے واضح لفظوں میں کہا تھا کہ: ''جنگ آپ پر مسلط کی جارہی ہے۔ آپ کو چاہیے کہ مذکرات سے راستہ نکالیں۔ کویت پر قبضہ اصول اور حکمت دونوں اعتبار سے گھاٹے کا سودا ہے''۔ ان کے نائب صدر سے ہم نے عراق میں گرفتار اخوان کے کارکنوں کی رہائی کے بارے میں بات کی، افسوس کہ انھوں نے کوئی واضح بات نہ کی۔

○ جہاد اور تصورِ جہاد: عیسائی مشنریوں، جنگ جُو صہیونیوں اور علمی دیانت سے تہی دامن مستشرقین نے مسلم معاشروں کے مغرب زدہ عناصر کی مدد سے جہاد کے لفظ کو منفی پروپیگنڈے کا ہدف بنادیا تھا۔ حسن البنا نے دعوت کے آغاز پر ہی یہ واضح کیا کہ جہاد کے معانی دراصل استبدادی، سامراجی اور طاغوتی قوتوں سے مقابلہ ہے۔ اس طرح انھوں نے بڑے نمایاں انداز سے دعوت، فکر، تشریح، ابلاغ، عمل، دفاع وغیرہ سے متعلق تفصیل سے راہ نمائی دی۔

اسی ضمن میں مولانا مودودی کا یہ بڑا اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں جہاد کے تصور کو اپنی معرکہ آرا کتاب الجہاد فی الاسلام میں نکھار کر امت کے سامنے پیش کیا۔[۱]

ادھر اخوان المسلمون ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی۔ حسن البنا کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے جہاد کے تصور کو نکھارنے کے ساتھ ساتھ فلسطین پر یہودی قبضے سے نجات پانے کے لیے مسلم امت کو اس کے لیے عملاً تیار بھی کیا۔ اس طرح وہ امت جو سیاسی غلامی، معاشی محکومی، اخلاقی ابتری اور فکری مرعوبیت کے ہاتھوں شکست اور پسپائی کی علامت بن چکی تھی، اسے علامہ محمد اقبال، حسن البنا شہید اور مولانا مودودی نے ایمان، اعتماد، امنگ، اور عزم کے ساتھ راستہ بنانے کی راہ دکھائی۔

حالیہ تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ مصر وہ پہلا ملک ہے جہاں کھل کر دین اور

۱- اس کتاب کے ابتدائی مباحث ۲ فروری سے ۱۵ جون ۱۹۲۷ء تک اخبار الجمعیة، دہلی میں شائع ہوئے۔ بعدازاں موضوع کی وسعت کے پیشِ نظر مولانا مودودی نے اسے مستقل کتاب کی شکل دے دی اور ۱۹۳۰ء میں دارالمصنفین، اعظم گڑھ نے اسے شائع کیا۔

سیاست کی تفریق کی بات پیش کی گئی تھی۔ برعظیم پاک و ہند میں مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ محمد اقبال اور مولانا مودودی کے مضبوط استدلال نے یہاں پر یہ بات نہیں چلنے دی، جب کہ مصر میں علی عبدالرزاق (م۱۹۶۶ ء) نے کھلے بندوں چیلنج کے انداز میں یہ بات کہی تھی کہ خلافت کا قیام ضروری نہیں ہے، اور دین اور سیاست کی تفریق ممکن ہے اور کچھ حالات میں مطلوب بھی۔ امام حسن البنا نے اس چیلنج کا فکری اور عملی سطح پر جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ: اسلام ایک ریاست، ایک نظام حکومت اور ایک معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔اس طرح انھوں نے ریاست کے اسلامی تصور کو تحرک اور تحریک کا حوالہ بنا دیا۔ بعدازاں مسلم دنیا میں جتنی بھی اسلامی تحریکیں اٹھیں، خواہ وہ اخوان المسلمون یا جماعت اسلامی کے قافلے سے الگ ہو کر چلیں یا الگ سے قائم ہوئیں، ان سب کا ایک اہم ہدف اسلامی ریاست کا قیام طے پایا۔آج اسلام پر جو بھی تحقیقی، تجزیاتی یا سخت متعصّبانہ مطالعات سامنے آرہے ہیں، ان میں اسلامی احیا اور اسلامی ریاست، اخوان، جماعت اسلامی، مولانا مودودی، سید قطب اور حسن البنا کا ذکر مرکزی موضوعات کے طور پر ملے گا۔

o حکمت عملی اور بحران: اخوان المسلمون ایک زندہ تحریک ہے، اور ایک فعال تحریک کی حیثیت سے اسے داخلی طور پر کئی بحرانوں سے گزرنا پڑا ہے۔ بعض اوقات اس کے مختلف وابستگان الگ بھی ہوئے ہیں، اور انھوں نے الگ سے اپنی راہ بنائی بھی ہے۔ جب وہ الگ ہوگئے تو پھر اپنے قول و فعل کے ذمہ دار وہ خود ہیں، اخوان المسلمون یا حسن البنا ان افراد کے کسی فعل کے لیے جواب دہ نہیں ہیں۔

اخوان المسلمون کے بڑے دھارے نے بڑے تسلسل کے ساتھ، استبدادی حکومتوں کی جانب سے مسلط کردہ آزمایش کا مقابلہ کیا۔ اپنے متوازن اور راست طریق کار کو انھوں نے ترک نہیں کیا اور نہ وہ کسی ردعمل کا شکار ہوئے۔ یہ دراصل حسن البنا کی اس تربیت کا کرشمہ ہے جس کے تحت مختلف نامساعد حالات کے باوجود انھوں نے راستہ نکالنے والی انقلابیت کا دامن تھامے رکھا۔ بالکل یہی صورت حال مولانا مودودی کے ہاں بھی دکھائی دیتی ہے، جو سخت سے سخت اشتعال انگیز حالات کے باوجود واقعات سے متاثر نہیں ہوتے، بلکہ خداداد دانش اور اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اس طرح راستہ بنا لیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

اخوان کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ لوگ تھے جنھوں نے شدید ردعمل میں آکر اخوان سے ناتا توڑ لیا اور اپنی نادانی سے استبدادی قوتوں کو مضبوط کیا۔ انجام کار ظلم کی سیاہ رات طویل ہوئی اور تبدیلی کے امکانات کی دنیا محدود ہوئی۔ دوسری جانب الگ ہونے والے وہ لوگ تھے، جو سمجھتے تھے کہ ہمیں مقتدر قوتوں کے ساتھ مل کر راستہ بنانا چاہیے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے صدر ناصر اور کچھ افراد نے صدر سادات سے تعاون بھی کیا، مگر کوئی امید بر نہ آئی بلکہ اس طرح وہ اور زیادہ بے وزن ہوئے۔ مقصد کا حصول دُور کی بات ہے، وہ خود اپنے مشن سے دور ہوتے چلے گئے۔ طاغوت کے طرف داروں سے مل کر طاغوت کو لگام دینا کارِمحال ہے۔ گویا کہ مقصد اور منزل کے بارے میں سمجھوتا تباہ کن ہوتا ہے۔

حکمت اور مصلحت، قرآن کے اصول ہیں۔ ان دونوں کا مفہوم سیرت پاک کے مطالعے سے متعین ہوجاتا ہے۔ ہر جگہ اور ہر دور میں اسلامی تحریکوں کو چاہیے کہ وہ ان اصولوں کو اپنی پالیسی کا حصہ بنا کر شہادتِ حق، تطہیر افکار اور تعمیر معاشرہ کا راستہ بنائیں۔ اس راستے کا انتخاب کرتے ہوئے غلطی بھی ہوسکتی ہے، لیکن غلطی تو اس صورت میں بھی ہوسکتی ہے کہ آپ پورے معاشرے سے کٹ کر کسی جنگل بیابان میں چلے جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اجتہادی غلطی کا بھی ایک اجر ہے اور اگر اجتہاد صحیح ہے تو اس کے دو اجر ہیں۔ اسی فریم ورک کے اندر اخوان کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی، اور آیندہ آنے والوں کے لیے بھی اہم سبق ہے۔

○ علمی میدان میں خدمات: عام طور پر ہمارے تحریکی حلقوں میں یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ حسن البنا شہید اور ان کے قریبی رفقا نے شاید کسی ٹھوس علمی کام کی بنیادیں استوار نہیں کیں، بلکہ یہ کام محض واعظانہ ابھار اور وقتی جوش و ولولے پر رواں دواں تھا۔ میرے خیال میں یہ تاثر سراسر معلومات کی کمی کے باعث پھیلا ہے۔ مصر میں اخوان کے علاوہ بھی علمی کام کی روایت گہری اور بڑی وسیع ہے۔ اس علمی روایت میں دونوں طبقے شامل ہیں، یعنی اسلام پر تنقید کرنے والے بھی اور اسلام کا دفاع یا اسلام پیش کرنے والے بھی۔ بلاشبہہ حسن البنا شہید نے کوئی بڑی بڑی کتابیں تصنیف نہیں کیں۔ ان کے ۲۰ رسائل اور بیش تر تقاریر ہیں۔ یہ مختصر رسائل بھی فکری گہرائی اور حکیمانہ راہ نمائی سے بھرپور ہیں، اور قرآن اور سیرت کے گہرے مطالعے اور اپنے دور

کے حالات پر انطباق کے مظہر ہیں۔

ہمارے ہاں علمی کام کا زیادہ حصہ اللہ کے ایک بندے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی فکروکاوش کا ثمرہ ہے۔ اس کے برعکس اخوان کے ہاں ہمیں نظر آتا ہے کہ ایک پوری ٹیم ہے جس نے مل کر یہ کام کیا ہے۔ اس کام کی وسعتوں کو دیکھیں تو یہ بڑا معرکے کا کام ہے۔ مثال کے طور پر عبدالقادر عودہ شہید نے اسلامی قانون پر جو کام کیا، وہ ۲۰ ویں صدی کے معتبر ترین کاموں میں سے ایک کام ہے۔ وہ اپنے فن کے ماہر تھے اور قرآن وسنت پر ان کی نگاہ بڑی گہری تھی۔ سید قطب شہید نے تفسیر فی ظلال القرآن، العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، معالم فی الطریق وغیرہ جیسی معرکہ آرا کتب لکھیں، بلکہ ادبی اور فکری نوعیت کی بڑی قابل قدر تصنیفات بھی پیش کیں۔ ڈاکٹر مصطفی حسنی سباعی کی ایک دو آرا سے اختلاف کے باوجود: السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی، نظام السلم والحرب فی الاسلام، المرأۃ بین الفقہ والقانون، الاستشراق والمستشرقون، المرونۃ والتطور فی التشریع الاسلامی، التکافل الاجتماعی فی الاسلام، غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں اور ان کے علاوہ بھی وہ مزید درجن بھر کتب کے مصنف ہیں۔ محمد الغزالی، بہی الخولی، محمد محمود الصواف، عبدالبدیع صقر، محمد احمد ابوشقہ، ڈاکٹر سید سابق، ڈاکٹر عبدالعزیز کامل، ڈاکٹر عیسیٰ عبدہ ابراہیم، ڈاکٹر محمد المبارک، ڈاکٹر سعید حویٰ، عبدالکریم زیدان، ڈاکٹر جمال عطیہ، ڈاکٹر یوسف قرضاوی، ڈاکٹر توفیق شاوی، پروفیسر مصطفی احمد زرقا، پروفیسر محمد قطب، پروفیسر عبدالحکیم عابدین، ڈاکٹر مالک بدری اور ان کے ہمراہ دیگر رفقا نے قائدانہ سطح کی کتب تحریر کیں۔ انھوں نے یہ کام ایک ٹیم کی طرح انجام دیا۔ اور اس قافلۂ علم ودانش میں آج بھی قیمتی اضافے ہو رہے ہیں۔ پھر خود امام حسن البنا کے والد گرامی احمد عبدالرحمن البنا نے الفتح الربانی (شرح مسند امام احمد) ۲۴ جلدوں پر مشتمل ایک بڑا وقیع علمی کارنامہ انجام دیا۔

اسی طرح صحافت کے میدان میں اخوان کے تجربات، ندرتِ خیال، بروقت اظہار، علمی شان اور عزم وحوصلے کو ابھارنے والا انداز بھی ایک قابل رشک پہلو رکھتا ہے۔ یہ ایک دو پرچوں کی بات نہیں، بلکہ اس میں عربی، انگریزی اور فرانسیسی میں درجنوں چھوٹے بڑے رسائل وجرائد

کے نام سامنے آتے ہیں۔ پابندیاں لگتی رہیں، مگر نام، اسلوب اور مقام بدل کر حق کی گواہی دینے کا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی نہیں کی گئی۔ پھر علمی اور تحقیقی مجلوں کو دیکھتے ہیں تو مختلف عرب ریاستوں اور یونی ورسٹیوں کے جرائد تک میں اخوانی علم کلام کی گونج سنائی دیتی ہے، کہیں دھیمے انداز میں اور کہیں پُرزور انداز میں۔ یہ سب کام ایمانی حلاوت، اجتماعی وابستگی، روحانی جذبے اور مؤثر تربیت کے نتیجے میں سامنے آئے ہیں۔

○ آج کا منظر نامہ اور تقاضے: تحریک احیاے اسلام کے مخالفین نے جماعت اسلامی اور اخوان المسلمون کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہوئے جہاد اور اسلامی ریاست کو ہدف تنقید بنایا ہے، اور ان دونوں چیزوں کو دہشت گردی سے جوڑ دیا ہے۔ درحقیقت اس مغربی جارحیت کا مرکزی نکتہ اسلام کا وہ تصور ہے کہ جس کی وجہ سے امت کا اجتماعی ذہن مغرب کی طاغوتی بالادستی اور اس کی ذہنی، فکری، معاشی اور تہذیبی حاکمیت کو ماننے سے انکار کرتا ہے۔ اہل مغرب یہ چاہتے ہیں کہ ان کی من مانی اور دھونس کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو۔ ہر کوئی، ہر معاملے میں انھی کے فکر، خیال، اقدام اور عمل کو قبول کرے اور ایک خادم کی حیثیت سے زندگی گزارنے پر تیار ہو۔ مغرب کے عزائم کے برعکس مسلمانوں کی تصورِ جہاد سے وابستگی لازوال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس امت کی طرف سے ہر نوعیت کے ظلم کے خلاف مزاحمت رک نہیں سکتی۔

اس جارحانہ پروپیگنڈے اور حالات وواقعات کے منفی بہاؤ کو دیکھتے ہوئے بسا اوقات لوگوں پر مایوسی کے آثار نظر آتے ہیں۔ بلاشبہہ بے جا خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے، لیکن خواہ مخواہ کی مایوسی بھی غلط ہے۔ دشمن کے پروپیگنڈے سے خائف نہیں ہونا چاہیے، مگر کھلی آنکھوں اور کشادہ ذہن کے ساتھ معاملات کا تجزیہ کرنے کا عمل بھی ترک نہیں کرنا چاہیے۔

موجودہ عہد میں جس وسعت اور جس شدت کے ساتھ مولانا مودودی، حسن البنا شہید، اور سید قطب شہید کے خلاف یہود ونصاریٰ اور ہنود پروپیگنڈا کر رہے ہیں، اس کی فکری، مذہبی اور عملی بنیادوں کا ادراک کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں سید قطب اور مولانا مودودی کی فکر کو درست پس منظر میں پیش کرنا نہایت ضروری ہے۔ جذباتی اور علامتی وابستگی سے بڑھ کر اسے شعوری اور نظریاتی تناظر میں سمجھنے اور پیش کرنے کی ضرورت ہے۔

مولانا مودودی اسلامی تحریکوں کے سامنے آج ایک بڑا چیلنج یہ بھی ہے کہ صف بندی گہرے شعور کے ساتھ کی جائے اور مسلمان نوجوانوں کو دردمندی سے سنبھالا جائے۔ اگر کوئی مسلمان نوجوان شدید دباؤ کے نتیجے میں ردعمل کے راستے پر جاتا ہے تو مجھے ڈر ہے کہ پھر وہ مغرب کے تعصب اور ظلم وستم کے جواب میں اور زیادہ تشدد کی طرف ہی جائے گا۔ اصولاً یہ راستہ نہ درست ہے اور نہ مطلوب۔ اگر یہ نوجوان سید قطب اور سید مودودی کے اصل فکری نظام (پیراڈائم) کو سمجھ لے گا تو ظلم کے خلاف دلیل کی قوت، کردار کی شان اور دعوت وحکمت کی طاقت کے ساتھ تو ضرور اٹھے گا، لیکن ایک ظلم کی جگہ وہ کبھی دوسرے ظلم کا حصہ نہیں بنے گا۔ یہ اسی وقت ہوگا جب وہ اس نظامِ فکر اور نظمِ تنظیم سے وابستہ ہوگا۔ اس طریقۂ کار کے لیے وقت لگے گا، محنت کرنا ہوگی، اور صبر وہمت سے کام کرنا پڑے گا۔

میں تشدد کے فروغ کی کسی بھی شکل کو حقیقی اسلامی تحریک اور اسلامی احیا کے لیے ایک تباہ کن خطرہ سمجھتا ہوں، تاہم کشمیر، فلسطین، چیچنیا میں آزادی کی تحریکوں، اور عراق وافغانستان پر غیرملکی تسلط کی نوعیت دوسری ہے۔ اسلام، انسانیت کے لیے نظامِ رحمت ہے، اور نبی کریمؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔ اسلام کے علَم بردار یہ بات قبول نہیں کرسکتے کہ ایک ظالم کے ظلم کی سزا دوسرے بے گناہ لوگوں کو دی جائے۔ اس لیے جب مزاحمت کا راستہ اختیار کرنے کا مرحلہ آئے تو وہ بھی، رحمت عالمؐ کے پیش کردہ نمونۂ عمل کو سامنے رکھ کر اختیار کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اختیار کردہ راستہ سرور عالمؐ کا راستہ نہیں ہوسکتا، چاہے اس کے لیے کیسے ہی خوش نما دعوے اور دلائل پیش کیے جائیں۔ جان لینا چاہیے کہ جہاد اور انتقامی تشدد کے درمیان بڑا فرق ہے۔ ہمیں دشمن کے کھیل کا حصہ نہیں بننا، مگر خاموشی سے بھی خود ہمارے اور اسلام کے بارے میں ایک غلط تصور پیدا ہوگا۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ انسانیت کو خیر کی طرف بلائیں اور شہداء علی الناس کی ذمہ داری ادا کریں۔ ہم سب کو فکر کرنی چاہیے کہ اسلام کی دعوت، تربیت، شناخت اور تحریک اسلامی کا امتیازی کردار مجروح نہ ہونے پائے۔

یہی حسن البناشہید اور مولانا مودودی کی دعوت اور ان کا پیغام ہے۔

✲✲✲